باب دہم

گہرا سیاہ راز

29 مئی کو وزیراعظم جونیجو اور اسمبلیوں کی برطرفی صرف اہل پاکستان ہی نہیں، پوری دنیا کے لیے ایک چونکا دینے والی خبر تھی۔ صدر نے کچھ دن پہلے پارلیمنٹ کے اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے وزیراعظم کو انتباہ کیا تھا کہ وہ اپنی روش تبدیل کر لیں۔ اوجڑی کیمپ کے سانحہ کے بعد چہ میگوئیوں کو ایک سلسلہ جاری تھا۔ اور ہر باخبر آدمی جانتا تھا کہ صدر اور وزیراعظم کے تعلقات خوشگوار نہیں، لیکن سب لوگ جانتے تھے کہ صدر میں صبر کرنے کی غیر معمولی صلاحیت موجود ہے، اس لیے کم ہی لوگ کسی بڑے اقدام کی امید کر رہے تھے۔ صدر نے رفتہ رفتہ ملک کے اندرونی نظام میں ہر چیز وزیراعظم کو سونپ دی تھی۔ جب 1987ء میں وزیراعظم نے وائس چیف آف آرمی سٹاف کی تقرری کے سوال پر اپنی رائے منوانے کی کوشش کی اور ملتان کے کور کمانڈر راجہ سروپ کو اس منصب پر فائز کرنا چاہا تو صدر اپنی پسند کے امیدوار سے دستبردار ہو گئے، اور انہوں نے معاملے کو سلجھانے کے لیے سینئر کور کمانڈر اسلم بیگ کی تقرری کا فیصلہ کر لیا۔ کئی مواقع پر وزیراعظم نے ان کی بات ماننے سے انکار کر دیا، تو صدر بدمزہ ہونے کے باوجود خاموش رہے۔ مثلاً جب میاں داد نے شارجہ میں آخری گیند پر چھکا لگا کر بھارت سے میچ جیتا تو کھلاڑی کی خواہش پر صدر نے اسے ملنے والی کار پر درآمدی ڈیوٹی ختم کرنے کا حکم دیا۔ پوری قوم اس بلے باز کو خراج تحسین پیش کر رہی تھی اور کوئی بھی پاکستانی صدر کی طرف سے انعام میں دی جانے والی رعایت پر اعتراض نہ کرتا، لیکن جونیجو نے ایسا کیا۔ وہ صاف صاف صدر کی توہین کر رہے تھے۔

اپریل میں جب صدر پارلیمنٹ سے خطاب کرنے والے تھے، تو وزیراعظم کے سیکرٹریٹ سے ایک تقریر انھیں لکھ کر بھجوا دی گئی۔ وہ شخص جس نے قومی اسمبلی کے ایک حلقے کا انتخاب جیتا تھا، اور جسے وزارت عظمیٰ عطا کی گئی تھی، بھارت اور برطانیہ کے وزیراعظم جیسے اختیارات طلب کر رہا تھا اور وہ بھی قوت کے مظاہرے سے۔ یہ قوت کہاں تھی؟ اگر صدر ان کے خلاف تحریک عدم اعتماد پیش کرنے کا فیصلہ کر لیتے تو کیا وہ اسے روک سکتے تھے۔ یہ درست ہے کہ انہوں نے صدر کی مجبوریوں اور مصلحتوں سے فائدہ اٹھا کر الیکشن سے باہر رہ جانے والی جماعتوں سے رابطے قائم کر لیے تھے، لیکن خود اسمبلی میں صدر کے حامیوں کی تعداد کم نہیں تھی اور جونیجو کسی اعتبار سے صدر سے بہتر حکمت کار (سٹریٹجسٹ) نہیں تھے۔ وہ ذاتی مراسم قائم کرنے کی ذرا بھی صلاحیت نہ رکھتے تھے اور ان کا واسطہ اس شخص سے تھا، جو اپنی ضرب المثل انکساری اور شائستگی سے دشمنی پر تلے آدمی کو رام کر سکتا تھا۔ کیا واقعی ابلاغ کے عجز کا شکار وزیراعظم فوجی اقتدار کے خلاف سیاسی کارکنوں، اخبار نویسوں، دانشوروں اور مختلف ناراض عناصر کی طرف سے پیدا کی جانے والی نفرت کو استعمال کرنے کا ارادہ رکھتا تھا؟ لیکن شاید سب سے بڑھ کر جینیوا مذاکرات کے لیے امریکہ، روس اور مغربی یورپ کا اصرار اس کا ترپ کو پتہ تھا۔ اس نے شریعت بل کا راستہ روک رکھا تھا اور اہل مغرب اسے ناپسند نہ کرتے تھے۔ اس نے افغانستان سے کبھی رابطہ نہ رکھا تھا اور علاقے میں بھارت کی بالادستی ختم کرنے کی کوششوں میں اس کا کوئی کردار نہیں تھا۔ وہ درحقیقت ایک لیڈر تھا ہی نہیں۔ وہ اس طرح کا ایک آدمی تھا، جس کی اب امریکہ، مغربی

یورپ اور حد تو یہ ہے کہ خود روس کو ضرورت تھی، جو ان چاروں کے پسندیدہ ظاہر شاہ کو اقتدار میں لانے کی کوششوں کی کبھی مزاحمت نہ کرتا۔ اب جبکہ بعض امریکی سیاست دانوں کی سالہا سال کی کوششوں سے بھارت، روس، امریکہ اور اسرائیل میں رابطے قائم ہو چکے تھے، تو پاکستان کے ایٹمی پروگرام کی حفاظت پر مصر، افغانستان کی مکمل آزادی کا آرزومند، بھارت سے متصادم، کشمیر کی تحریک آزادی کے لیے خاموشی سے کام کرتا، اور شرعی قوانین کے نفاذ کا حامی صدر، پاکستان کے دشمنوں اور ''سرپرستوں'' کو قبول نہ تھا اور حیرت انگیز بات یہ تھی کہ اب علاقے میں ان سب کے مفادات ایک ہو گئے تھے، وہ سب علاقے میں بھارت کے غلبے پر متفق ہو گئے تھے، سب ''بنیاد پرستوں'' کے دشمن تھے، سب ظاہر شاہ پر اتفاق کرتے تھے۔

جینیوا معاہدے پر بات چیت کے آخری مرحلے میں صدر تنہا رہ گئے۔ جونیجو نے اس کے لیے پیپلز پارٹی کی تائید حاصل کر لی تھی، جو 1984ء تک ببرک کارمل سے براہ راست مذاکرات کی حمایت کر رہی تھی اور جس کے بیش تر رہنما افغان مجاہدین کے اتنے ہی مخالف تھے، جتنے کہ بھارت اور روس نواز عبدالولی خان۔ دستخطوں کی مقررہ تاریخ قریب آ پہنچی اور صدر یہ کہہ کے اسے موخر کرنے پر اصرار کرتے رہے کہ چند ہفتوں کی تاخیر سے کوئی قیامت نہیں ٹوٹ پڑے گی تو امریکی صدر نے فون پر ان سے رابطہ کیا۔ آخر کار مجبور آدمی نے ہاں کر دی۔ ہمیشہ کی طرح انہوں نے معاملے کو موخر کرنے اور اپنے پتے نئے سرے سے ترتیب دینے کا فیصلہ کیا۔ صدر نے کوئی جماعت نہیں بنائی تھی۔ انہوں نے افغانستان میں اپنی جنگ خاموشی اور خفیہ طریقے سے لڑی تھی اور اب یکا یک اس وقت ساری دنیا کے خلاف اعلان جنگ نہیں کر سکتے تھے، جب پاکستان میں افغان مجاہدین کے حامی سیاسی حلقے بھی ان سے دور چلے گئے تھے۔

آزاد، ملول اور تنہا صدر نے جن کے بالکل سامنے ایک عظیم تاریخی موقع ضائع کیا جا رہا تھا، اپنے اعصاب پر قابو رکھا۔ آخر شب عبادت کرنے والے تقدیر پرست آدمی کا اس میں کوئی جواب نہ تھا۔ دوسروں کے سامنے وہ ہنستا تھا، اپنے معمولات جاری رکھے ہوئے تھا، لیکن کوئی نہیں جانتا تھا کہ اس کے دل پر کیا بیت رہی ہے۔ اس نے اقتدار عملاً دوسروں کے حوالے کر دیا تھا اور نازک خارجہ معاملات کے علاوہ، جن پر کھلے عام بحث کا وہ قائل نہ تھا، ہر چیز سے لاتعلقی اختیار کر کے ایک استاد اور فلسفی کا کردار نبھانے کی کوشش کر رہا تھا۔ کیا اسے گالی دینے اور اسے دیوار کی طرف دھکیلنے والوں میں سے کسی کو احساس نہیں تھا کہ آخر کار وہ گوشت پوست کا بنا ایک آدمی ہی تو ہے، ایک دن اس کے اعصاب جواب دے سکتے ہیں۔ لیکن عملی سیاست تو شاید ایک کاروبار کی طرح ہوتی ہے، جس میں صرف اپنے منافع کا حساب رکھا جاتا ہے اور جس میں لالچ کے شکار لوگ بعض اوقات دوسروں سے بھی بڑھ کر اپنے نقصان کا راستہ کھولتے ہیں۔

وزیر اعظم اس وقت چند گھنٹے پہلے مشرق بعید سے آئے تھے اور انہیں ایک دوسرے ملک کی طرف جانا تھا۔ وہ جینیوا معاہدے کو اپنی کامیابی سمجھ رہے تھے، جس کے نتیجے میں مہاجر واپس چلے جائیں گے۔ پاکستان کی سیاسی جماعتیں اور اخبارات ان کی تحسین کریں گے اور ساری دنیا ان پر مہربان ہو گی۔ صدر کو شکست دینے پر وہ خوش تھے اور اب وہ جنرل اختر عبدالرحمٰن سمیت بعض دوسروں کے خلاف کارروائی کرنے کا منصوبہ بنا رہے تھے۔ انہیں یقین تھا کہ اس کے بعد وہ ملک کے طاقتور اور مکمل طور پر بااختیار حکمران بن کر ابھریں گے۔ وہ وزیر اعظم ہاؤس کے باغیچے میں تشریف فرما تھے، جب انہیں برطرفی کی خبر دی گئی۔ انہیں یقین ہی نہیں آ رہا تھا، اور وہ بار بار حیرت سے استفسار کرتے رہے۔

کیا صدر جنرل محمد ضیاالحق اور جنرل اختر عبدالرحمٰن کو اندازہ نہیں تھا کہ بہت سی اندرونی اور بیرونی طاقتوں کی مخالفت مول لے کر وہ کس راستے پر چل نکلے ہیں؟ یہ کئی ماہ پہلے کی بات ہے، جنرل اختر عبدالرحمٰن گالف کورس میں جوگنگ کرتے ہوئے اچانک رکے اور انہوں نے اپنے بیٹے ہارون خان سے دفعتاً کہا، ''ہمیں جو کچھ کرنا تھا، ہم نے کر ڈالا، لیکن اب وہ ہمیں چھوڑیں گے نہیں''۔ اسرار سے بھرا مختصر جملہ کہہ کر وہ پھر سے بھاگ کھڑے

ہوئے۔ یہ ان کے لیے سوچ بچار اور سیر کا وقت تھا، اور انہوں نے کبھی اسے گفتگو میں ضائع نہیں کیا تھا۔ ساری زندگی وہ اپنے معمولات اور خود سے طے کردہ راستوں پر چلتے رہے تھے اور اب، اس نازک مرحلے میں بھی تبدیلی کا کوئی ارادہ نہ رکھتے تھے۔ ایک عشرے تک انہوں نے ایک جنگ لڑی تھی۔ دشمن کا قرض چکایا تھا، کامیابیاں حاصل کی تھیں، اور مستقبل کی عظیم فتوحات کی بنیاد رکھ دی تھی، پھر وہ اپنی راہ کیوں بدلتے۔ یہ درست ہے کہ مسائل اور خطرات موجود تھے، لیکن وہ کوئی تاجر تو نہیں تھے کہ نفع ونقصان کا بہی کھاتہ کھول کر دیکھتے۔ وہ تو ایک جرنیل تھے اور تاریخ کی جاودانی چاہتے تھے، وہ تو ایک مسلمان تھے، اور انہیں اپنے رب کے پاس جانا تھا۔ امید کا چراغ ہمیشہ اس آدمی کے دل میں جلتا رہا تھا، وہ اسے خود ہی کیسے گل کر دیتا۔ اس کا لیڈر ضیاالحق تھا، جو آفت اور آزمایش کی گھڑی میں آسمان کی طرف انگلی اٹھاتا اور اسے کہتا تھا، ''اختر، غم نہ کرو، خدا ہمارے ساتھ ہے۔''

جونیجو نے اپنی برطرفی پر پہلے دن کسی ردعمل کا اظہار نہ کیا۔ وہ ششدر اور خوف زدہ تھے۔ دوسرے روز اپنے ساتھیوں کے اصرار پر وہ اخبار نویسوں سے ملے۔ انہوں نے اس اقدام کی تائید نہیں کی، لیکن ان کا رویہ اب بھی مفاہمانہ تھا۔ وہ یہ اندازہ لگانے سے قاصر تھے کہ کیا ہونے والا ہے اور انہیں کرنا کیا چاہیے۔ شام کو وہ مئی کے آخری دن کی گرمی میں سویٹر پہنے صدر سے جا کر ملے۔ انہوں نے شکایت تو کی، لیکن احتجاج نہیں کیا۔ وہ ایک لیڈر نہیں تھے اور خطرات مول نہیں لے سکتے تھے۔

اخبارات اور سیاسی جماعتوں نے مخالفت کا طوفان کھڑا کر دیا۔ صدر نے جونیجو کی حکومت پر بدعنوانی، امن وامان کی تباہی اور شرعی قوانین نافذ کرنے کی ذمے داری سے انحراف کے الزامات عائد کیے۔ انہوں نے تیزی کے ساتھ غریبوں کی بہبود کے اقدامات اور قاضی عدالتوں کے قیام کا وعدہ کیا، لیکن اپنے خطاب میں انہوں نے افغانستان اور اوجڑی کیمپ کے حوالے سے درپردہ سازشوں کو کوئی ذکر نہ کیا۔ انہوں نے جونیجو کے ذاتی رویے کی تعریف اور جلد از جلد انتخابات کرانے کا اعلان کیا۔

صدر مستقبل کی صورت گری کے لیے منصوبہ سازی میں مصروف تھے۔ اپنے دوستوں، دانشوروں، سیاست دانوں اور جرنیلوں سے انہوں نے طویل گفتگوئیں کیں۔ انہوں نے قوم کو بتایا کہ نئے انتخابات غیر جماعتی بنیادوں پر ہوں گے اور اپنی ایک نشری تقریر میں غریبوں کی حالت زار کا ذکر کرتے ہوئے ان کی آواز رندھ گئی۔ جب لوگوں نے ان کا مذاق اڑانے کی کوشش کی، تو لاہور کے ایک دانشور نے، جو اب پیپلز پارٹی میں شامل ہیں، اس مصنف کے ساتھ اپنے طویل انٹرویو میں کہا کہ وہ خود بھی گریہ کرنے والے آدمی ہیں اور یہ جانتے ہیں کہ صدر کا دل خون کے آنسو رو رہا ہے۔ انہوں نے کہا، یہ کیسی عجیب بات ہے کہ آج جب وہ شخص روس، امریکہ اور بھارت کے مقابلہ کر رہا ہے تو قوم نے اسے تنہا چھوڑ دیا ہے۔

صدر منصوبہ بناتے رہے اور وہ کسی چیز سے مطمئن نہ ہو پائے۔ انہوں نے متناسب نمایندگی کی بہت سی صورتوں پر بھی تبادلہ خیال کیا۔ انہوں نے انتخابی شیڈول کا اعلان کر دیا اور ضروری قوانین بنانے کے بارے میں سوچتے رہے۔ وہ واضح طور پر ملال کا شکار تھے کہ انہوں نے غیر جماعتی ایوان کو جماعتی اسمبلی میں تبدیل کرنے کی اجازت کیوں دی اور اگرچہ وہ ہمیشہ کی طرح اب بھی کہتے تھے کہ لوگ ان کی مشکلات کا ادراک نہیں کرتے، لیکن اب وہ مفلسوں اور مجبوروں کی بہبود اور انقلابی اسلامی قوانین کے لیے خطرہ مول لینے پر تلے ہوئے تھے۔ وہ اب بھی ملک کو پیپلز پارٹی کی حکمرانی سے بچانے کا مکمل عزم رکھتے تھے۔ انہوں نے جنرل اختر کو بار بار مشورے کیلے بلایا اور اس پر افسوس کا اظہار کیا کہ ان کے ساتھ ایک مکمل منصوبے کی تشکیل میں ان کی پوری مدد نہیں کر سکے، اور وہ چیلنج کی نوعیت کو سمجھ نہیں رہے۔

جولائی کے آخر میں صدر نے جنرل اختر سے اشارتاً کہنا شروع کیا کہ انہیں گڑبڑ کے آثار دکھائی دے رہے ہیں۔ پھر انہوں نے ایک شخص کا نام لے کر کہا کہ انہیں اس کا رویہ مشکوک نظر آتا ہے۔ ایک روز جنرل اختر نے صدر کو اس شخص کے ساتھ گالف کھیلتے دیکھا۔ کھیل سے فارغ ہو کر وہ جنرل

اختر کو ایک طرف لے گئے اور کہا کہ وہ اس کا ذہن پڑھنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ پھر انہوں نے کہا، مجھے شبہ ہے کہ کچھ ہو رہا ہے، آپ ہوشیار رہیں۔

جنرل اختر جولائی کے ایک دن چیئرمین جوائنٹ چیفس آف سٹاف کمیٹی کے دفتر پہنچے تو انہوں نے اپنے ڈائریکٹر جنرل امتیاز وڑائچ کو طلب کر کے سوال کیا کہ اگر بالفرض کسی وقت ہمارے دفتر پر دہشت گرد حملہ کر دیں، تو اس سے نمٹنے کے کیا انتظامات ہیں۔ جنرل وڑائچ نے انہیں اس اہم دفتر کے لیے کیے جانے والے حفاظتی اقدامات کی تفصیل سے آگاہ کیا، لیکن جنرل اختر اس سے مطمئن نہ ہوئے۔ ان کا کہنا تھا کہ یہ تو معمول کے انتظامات ہیں، اور اگر کوئی غیر معمولی صورت حال پیدا ہو جائے تو اس سے نمٹنے کے لے یہ بندوبست کافی نہیں۔ چنانچہ تفصیلی بحث کے بعد ان انتظامات کو موثر بنانے کے لیے اقدامات کیے گئے۔

صدر بہت دنوں سے اصرار کر رہے تھے کہ افغانستان سے متعلق آئی ایس آئی کے سیل کو الگ کر کے اسے چیئرمین جوائنٹ چیفس آف سٹاف کمیٹی سے متعلق کر دیا جائے اور جنرل اختر ایک بار پھر اس معاملہ کو ہاتھ میں لے لیں۔ اگرچہ ان کی رائے میں جنرل حمید گل پر جوش، محبّ وطن، قابل اعتماد اور ذہین آدمی تھے، لیکن وہ فوج اور آئی ایس آئی میں اعلیٰ سطح کی اہم تبدیلیوں کا فیصلہ کر چکے تھے۔ انہوں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ غلام مصطفےٰ جتوئی ان کے وزیراعظم ہوں گے اور وہ 26 اگست کو حلف اٹھائیں گے۔ جنرل اختر اول اول افغان مسئلے کو ہاتھ میں لینے سے ہچکچا رہے تھے، لیکن بہاولپور روانگی سے پہلے صدر نے ایک بار پھر اصرار کیا تو وہ آمادہ ہو گئے۔ ایک مرحلے پر انہیں یہ خیال بھی گزرا کہ صدر انہیں مارشل لا نافذ کرنے کے لیے کہہ سکتے ہیں۔ صدر نے ان سے یہ نہیں کہا، اشارتاً بھی نہیں اور ظاہر ہے خود وہ صدر سے اس موضوع پر بات نہیں کر سکتے تھے۔ ان کی ذاتی رائے یہی تھی کہ مارشل لا کا نفاذ مناسب نہیں۔

جنرل اختر صورت حال کے بارے میں تشویش کا شکار تھے۔ وہ غور و فکر جاری رکھے ہوئے تھے۔ 15 اگست کو وہ رات ڈیڑھ بجے آئی ایس آئی کے بریگیڈئر امتیاز سے صلاح مشورہ کرتے رہے۔ یہ بہت غیر معمولی بات تھی، کیونکہ وہ رات بارہ بجے سو جانے کے عادی تھے۔ اور انہوں نے زندگی میں بہت ہی کم اس سے انحراف کیا تھا۔ وہ بہاولپور جانا نہیں چاہتے تھے۔ ایک ٹینک کی کارکردگی دیکھنے سے انہیں بہت زیادہ دلچسپی نہیں تھی۔ یوں بھی وہ وقت برباد کرنے والی تقریبات سے دور رہتے تھے۔ بریگیڈئر امتیاز نے انہیں مشورہ دیا کہ وہ بہاولپور جانے سے ہچکچائیں نہیں کہ فوج کی ساری قیادت وہاں جا رہی ہے۔ بریگیڈئر امتیاز ایک عرصہ تک ان نائب رہے تھے۔ وہ کراچی کے آئی ایس آئی دفتر کے انچارج تھے اور کرنل کے طور پر ترقی سے محروم رہے تھے۔ جنرل اختر محنتی آدمی کو اسلام آباد لائے اور صدر سے یہ کہہ کے ان کی ترقی کا اہتمام کیا، جو ان کی صحت پر اعتراض کے سبب روک لی گئی تھی، کہ وہ اندرون ملک سیکورٹی کے انچارج تھے اور جوائنٹ چیفس آف سٹاف کمیٹی کے چیئرمین کے مقابلے میں، بعض چیزوں کے بارے میں زیادہ باخبر ہو سکتے تھے۔ ان کے درمیان ایک عرصے سے گہرا تعلق چلا آ رہا تھا، جب مارچ 1987ء میں جنرل اختر آئی ایس آئی سے الگ ہو کر چیئرمین بنے تو بریگیڈئر امتیاز رو پڑے اور روتے روتے انہوں نے اپنا سر ان کے ہاتھوں پر رکھ دیا تھا۔ ایسے آدمی کے مشورے کو نظر انداز کرنا موزوں نہیں تھا۔ 6 اگست کی شام کو انہوں نے ایک بار پھر اس موضوع پر بریگیڈئر امتیاز سے گفتگو کی، جن کی رائے میں فوج میں تبدیلیاں ہونے والی تھیں۔ اس گفتگو کے بعد انہوں نے آخری فیصلہ کر لیا۔ خود صدر بھی بہاولپور جانے کے بارے میں تامل کا شکار رہے تھے۔ لیکن میجر جنرل محمود علی درانی کے مسلسل تقاضوں پر وہ آمادہ ہو گئے تھے، جو ان کے ملٹری سیکرٹری رہ چکے تھے اور بھروسے کے آدمی تھے۔

جنرل اختر کو کوئی چیز بے قرار کر رہی تھی۔ انہوں نے امریکہ میں مقیم اپنے بیٹے اکبر خان، کینیڈا میں غازی خان اور چند دنوں سے ان کے اصرار پر پاکستان آئے ہوئے ہمایوں اختر خان اور ہارون خان سے لاہور میں فون پر رابطہ کرنے کی کوشش کی، لیکن ان میں سے کسی سے رابطہ نہ ہو سکا۔ دو دن

پہلے ان کی اہلیہ نے اپنے خواب میں دو کفن پوش روحوں کو اپنے گھر سے آسمان کی طرف پرواز کرتے دیکھا تھا۔ اگر چہ انہوں نے اس خیال کو اپنے ذہن پر مسلط نہ ہونے دیا، اور انہیں تسلی و تشفی دی لیکن وہ مکمل طور پر اسے اپنے ذہن سے جھٹک بھی نہ سکے تھے۔

ادھر پچھلی دیوار کے پاس آرمی ہاوس کے مکین کے لیے بھی یہ معمول کی رات نہیں تھی۔ اگر چہ اس نے اہل خانہ کو ایسا کوئی اشارہ نہیں دیا تھا کہ وہ مشکل میں ہے، یا اسے کسی اندیشے نے آگھیرا ہے، لیکن رات کے تین بجے اس نے کینیڈا کے شہر ٹورنٹو میں اپنے بیٹے اعجاز الحق کے ساتھ گفتگو کرنے کی کوشش کی، لیکن رابطہ قائم نہ ہو سکا۔ انہوں نے اہلیہ کو نیند سے بیدار کیا اور کچھ دیر اس ماضی کے بارے میں گفتگو کرتے رہے، جس سے ان دونوں کو کوئی شکایت نہ تھی۔

اگلی صبح جنرل اختر معمول کے مطابق سو کر اٹھے۔ معمول کے مطابق انہوں نے چائے کی ا ایک پیالی لی، پھر اخبارات پڑھے، غسل کیا، کلف لگی وردی پہنی، ہلکا سا ناشتہ کیا اور چانے کے لیے تیار ہو گئے۔ 1982ء تک، جب تک بوا جی زندہ تھیں، وہ دفتر جاتے وقت آیت الکرسی پڑھ کر بیٹے پر دم کیا کرتی تھیں، اس کے بعد ان کی رفیق زندگی نے اس معمول کو جاری رکھا۔ آج بھی ایسا ہونا چاہیے تھا، لیکن ایسا نہیں ہوا اور جب وہ گھر کے بڑے دروازے کی طرف بڑھے تو وہ قرآن مجید لے کر آئیں اور انہیں اس کے نیچے سے گزرنے کو کہا۔ یہ سب کیا ہو رہا تھا؟ وہ کبھی تو ہم پسند اور اندیشوں کا شکار ہونے والا نہیں تھا، لیکن یہ سب کیا ہو رہا تھا۔ رشیدہ بیگم نے انہیں نہیں بتایا کہ آج کی رات انہوں نے پھر ایک خواب دیکھا ہے اور یہ بتانے کی ایسی بے تابی بھی کیا تھی، یوں بھی یہ ایک خوبصورت خواب تھا، جس میں انہوں نے اپنے دوپٹے پر ہیرے جڑے دیکھے تھے۔

پاک ون سی 130 چکلالہ کے فضائی مستقر سے پونے آٹھ بجے بہاولپور سے روانہ ہوا، جہاں ہیلی کاپٹر سے پندرہ منٹ کی پرواز کے فاصلے پر خیر پور ٹامیوالی میں انہیں ایم ون اے ون امریکی ٹینک کا مظاہرہ دیکھنا تھا۔ طیارے میں صدر کے علاوہ کئی اعلیٰ فوجی افسر سوار تھے۔ بار بار یہ سوال کیا گیا اور اس سوال کا کوئی جواب نہ ملتا کہ صدر اتنے جرنیلوں کو ساتھ کیوں لے گئے۔ ایک معتبر ذریعے کے مطابق صدر شکوک کا شکار تھے، اور وہ اعلیٰ فوجی افسروں کو اپنے ساتھ رکھنا چاہتے تھے۔

خیر پور ٹامیوالی میں امریکی ٹینک ایم ون اے ون کی کارکردگی متاثر کن نہ تھی، لیکن صدر اسے بدمزہ نہ ہوئے اور بہاولپور لوٹ آئے۔ یہاں انہوں نے ظہر کی نماز پڑھی اور دوپہر کا کھانا کھایا۔ پہلے سے طے شدہ پروگرام پر عمل کرنے کے بجائے باجماعت نماز کی جگہ بدل دی گئی، اور کھانے کے کمرے میں صدر زیادہ خوش دکھائی نہ دیے۔

تین بج کر 46 منٹ پر صدر کا جہاز بہاولپور کے رن وے سے اڑا، ان کی دعوت پر امریکی سفیر آرنلڈ رافیل اور پاکستان میں امریکی فوجی مشن کے سربراہ ہربرٹ واسم بھی اس جہاز میں آ بیٹھے، لیکن جنرل اسلم بیگ نے صدر کی دعوت قبول نہ کی۔ انہوں نے کہا کہ وہ راستے میں ایک فوجی اجلاس کے لیے رکیں گے۔ صدر نے کہا، ہاں، آپ کا جہاز بھی کھڑا ہے۔ بہاولپور کے ہوائی اڈے سے صدر کا جہاز اڑنے کے لگ بھگ اڑھائی منٹ بعد بہاولپور کے ٹریفک کنٹرولر نے رابطہ کرنے کی کوشش کی، لیکن کوئی جواب نہ ملا۔ چند لمحے بعد فلائٹ لفٹیننٹ ساجد چودھری کی آواز سنائی دی، ''سٹینڈ بائی'' اس کے بعد خاموشی چھا گئی۔ ٹریفک کنٹرولر نے پھر رابطہ کرنے کی کوشش کی، پھر سٹینڈ بائی کی قدرے بلند تکرار سنائی دی۔ چند لمحوں کے بعد ایک اور کمزور آواز سنائی دی، ''مشہود، مشہود'' خیال ہے کہ یہ صدر کے ملٹری سیکرٹری بریگیڈیئر نجیب احمد کی آواز تھی۔ کیا کاک پٹ میں بیٹھے لوگ بے ہوش ہو چکے تھے ؟ تین بج کر 49 منٹ پر جہاز ہوا میں ہچکولے کھاتا دکھائی دیا اور دو منٹ کے اندر اندر ناک کے بل زمین پر آ رہا۔ یہ بہاولپور کے ہوائی اڈے سے 9 کلومیٹر دور دریائے ستلج کے پار بستی لال کمال کا علاقہ تھا، چاروں طرف اگی فصلوں کے درمیان یہ ایک چھوٹا سا ویران قطعہ تھا۔

جہاز اب آگ کا گولہ بن چکا تھا۔ کوئی نہیں جانتا کہ اس آگ کو بجھانے کی کوشش کیوں نہ کی گئی، جہاں زندگی کی موہوم سی امید ہوسکتی تھی۔ بیگم ضیاالحق کے بقول، ''وہاں وہ کور تھی، جس انہوں نے معائنہ کیا تھا، لیکن کوئی آگ بجھانے نہ آیا، انہوں نے رسیاں باندھ کر گھیرا ڈال دیا۔ لوگ پانی کی بالٹیاں لے کر پہنچ گئے، لیکن کسی کو جہاز تک جانے کی اجازت نہ دی گئی۔''

جنرل اسلم بیگ کا طیارہ اس وقت بہاولپور کے ہوائی اڈے پر تھا، اور غالباً ان کے جیٹ طیارے میں سی 130 کی تباہی کا سگنل موصول ہوا۔ وہ ائرپورٹ سے اترے۔ انہوں نے فضا میں چکر لگایا اور سیدھے راولپنڈی پہنچ گئے۔ یہاں انہوں نے سینئر فوجی افسروں کا اجلاس بلایا۔ سینیٹ کے چیئرمین جناب غلام اسحاق خان سے دستور کے مطابق صدارت کا عہدہ سنبھالنے کو کہا گیا۔ جنہوں نے فوراً ہی جنرل مرزا اسلم بیگ کو چیف آف آرمی کمان کے منصف پر فائز کر دیا۔ پشاور سے کار میں آنے والے جنرل فضل الحق اجلاس میں تاخیر سے پہنچے۔ ان کا اصرار تھا کہ راولپنڈی کے کور کمانڈر جنرل عمران اللہ کو کمانڈر انچیف اور سب سے سینئر جرنیل مرزا اسلم بیگ کو جوائنٹ چیفس آف سٹاف کمیٹی کا چیئرمین بنا دیا جائے، لیکن ان کی بات کسی نے نہ سنی۔ ملک اب نئے ہاتھوں میں تھا۔ بعد میں روتے ہوئے انہوں نے کہا، کاش، اختر ہی بچ گیا ہوتا'' ساڑھے چار بجے تک کراچی، لاہور اور اسلام آباد سمیت ملک کے تمام شہروں میں صدر کے طیارے کی تباہی کی خبر پہنچ چکی تھی۔

19 اگست کی صبح جنرل اختر عبدالرحمٰن کی میت ان کے گھر لائی گئی۔ بتایا گیا تھا کہ حادثے میں جسم راکھ بن چکے ہیں اور چہرے ثابت و سالم نہیں رہے، لہٰذا سوگ میں ڈوبے، آہوں اور سسکیوں سے آباد گھر میں کسی نے رخصت ہو جانے والے کا چہرہ نہیں دیکھا کہ یادوں کی ابدیت میں وہ ایسا ہی توانا، تازہ، جیتا جاگتا اور رستا بستا رہے۔ ہزارہا غمزدہ لوگوں نے جنازے میں شرکت کی، جن میں صرف چند سو ہی جانتے ہوں گے کہ وہ جس آدمی کو مٹی کے سپرد کرنے جا رہے ہیں، درحقیقت کون اور کیا تھا۔

20 اگست کو اسلام آباد کے ایوان صدر سے ضیاالحق کا جنازہ اٹھا۔ ضیاالحق کی نامقبولیت پر متفق اخبار نویسوں، دانشوروں، سیاست دانوں اور حکمرانوں کے لیے یہ حیران کر دینے والے دن تھا۔ ششدر اور مبہوت، انہوں نے دیکھا کہ گریہ کرنے والوں میں اپاہج، کمزور اور مفلس لوگ کتنی بڑی تعداد میں شامل تھے۔ گریہ کرتی بیوہ عورتیں، یتیم اور معذور بچے۔ پھر تحسین کا طوفان اٹھا۔ دنیا کے اہل دانش، جرنیل، مدبر، حکمران، ادیب اور شاعر اس کو روئے، جسے گیارہ سال سے گالی دی جا رہی تھی۔ صرف زبگنیو برزنسکی ہی نہیں، بہت سے دوسرے باخبروں نے دنیا کو بتایا کہ تاریخ کی لوح ابدیت پر اس کا نام لکھا جانے والا ہے۔

اہل وطن کو یہ خبر بی بی سی، نیوز ویک اور ٹائمز لندن نے دی کہ ضیاالحق کا ممکنہ جانشین اختر عبدالرحمٰن نامی جرنیل تھا۔ دس کروڑ انسان اس آدمی سے ناواقف تھے جسے نہ قتل کر دیا جاتا، تو دشمن کا منصوبہ کامیاب نہیں ہوسکتا تھا۔ بے خبری کی دھند سے دھیرے دھیرے ایک نادر و نایاب اور خیرہ کن تصویر ابھرنے لگی۔ کیا وہ شاعر اسد اللہ خان غالب کی طرح تھا؟ لیکن غالب کا اعتراف کچھ لوگوں نے تو کیا ہی تھا۔ یہ تو عجیب آدمی نکلا، بھلا تاریخ میں کبھی ایسا بھی ہوا تھا کہ میدان کارزار کا ایک شہسوار اپنی موت کے بعد دنیا پر منکشف ہو۔

شہید صدر کی مرقد پر پھول برسائے جا رہے تھے۔ جنرل مرزا اسلم بیگ نے اعلان کیا کہ آرمی ہاؤس کو قومی یادگار میں تبدیل کر دیا جائے گا۔ ٹی وی پر فلمیں دکھائی دی جانے لگیں۔ شاعروں نے مصرعوں کو سسکیوں اور حسرتوں سے بنا، حتیٰ کہ چاہنے والوں کے لیے غم کی ردا نے جیسے چاند ستاروں کو ڈھانپ دیا۔ اور پھر سوال اٹھا کہ وطن اور اسلام کے ان سپاہیوں کا قاتل کون ہے؟

لاشیں پوسٹ مارٹم کے بغیر دفنا دی گئیں۔ امریکہ کے دفتر خارجہ سے متعلق افسروں نے معتبر صحافیوں کو رازداری سے یہ بتانے کی کوشش کی کہ یہ

حادثہ ہوسکتا ہے۔ایف بی آر کی ٹیم کو پاکستان آنے سے روک دیا گیا۔اور پاکستانی فضائیہ کے سربراہ نے حادثے کے اسباب کا سراغ لگانے کے لیے ایک ٹیم مقرر کردی۔

دوہفتوں کے بعد ریڈیو اور ٹی وی سے صدر کا ذکر غائب کردیا گیا۔صدر نے وزیراعظم کی تقرری سے انکار کیا اور جماعتی انتخابات کا اعلان کردیا۔ لاہور ہائی کورٹ نے جس میں 17 اگست کی صبح ایک رٹ دائر کی گئی تھی، وزیراعظم اور اسمبلیوں کی برطرفی کو ناجائز قرار دیا،لیکن جونیجو کی حکومت بحال نہ کی ۔سپریم کورٹ نے بھی اس فیصلے کو برقرار رکھا، جبکہ معلومات کی بنیاد پر جونیجو اچکن پہن کر آئے تھے کہ عدالت سے سیدھے وزیراعظم ہاوس جا سکیں۔کمانڈر انچیف نے تمام سیاست دانوں سے خفیہ ملاقاتیں کیں، بےنظیر نے فوج کے ساتھ نامہ وپیام کیا۔اسلامی جمہوری اتحاد وجود میں آیا اور جونیجو کو مکھن سے بال کی طرح نکال دیا گیا۔انتخابی مہم شروع ہوئی تو بیگم نصرت بھٹو نے بیان دیا کہ پاکستان کی ایٹمی تنصیبات عالمی معائنے کے لیے کھول دی جائیں گی۔اس پر مزاحمت کا طوفان اٹھا،تو بےنظیر بھٹو نے سیاچین گلیشیئر کے حوالے سے مرنے والے پر بہتان باندھے،لیکن مسجد فیصل کے سایے میں سونے والے کا وکیل کوئی نہ تھا۔اسلامی جمہوری اتحاد کے پلیٹ فارم سے افغان جہاد کی حمایت میں شوروغوغا تو اٹھا،لیکن کسی کو اس جہاد کے لیے تنہا اٹھ کھڑے ہونے اور پہاڑ ایسی آزمائشوں سے گزرنے والوں کی یاد نہ آئی۔

بےنظیر کے اقتدار میں آنے سے چندروز پہلے فضائیہ کے تحقیقاتی بورڈ نے اپنی رپورٹ پیش کردی۔یہ حادثہ نہیں صریحاً تخریب کاری تھی،لیکن قاتل کون تھے؟ بورڈ نے سفارش کی کہ مجرموں کا سراغ لگانے کے لیے الگ سے تحقیقات کی جائے؛ چنانچہ صدر غلام اسحاق خاں کے حکم پر آئی ایس آئی اور ایف آئی اے کے افسروں پر مشتمل ایک تحقیقاتی کمیٹی قائم کی گئی۔ایک وفاقی سیکرٹری ایف کے بندیال نے ریڈر ڈائجسٹ کے ایڈیٹر کو جون 1989ء میں خوب صورت انگریزی میں خط لکھا کہ ان کی کمیٹی بڑی سرگرمی سے تحقیقات کررہی ہے۔یہ خط پاکستانی اخبارات میں لیڈ سٹوری کے طور پر چھپا۔ اگلے دن اعجاز الحق نے اس کے مندرجات کی تردید کردی، پھر سرکار خاموش ہورہی۔پونے دوسال گزر چکے،اور اب تک کسی کو معلوم نہیں کہ یہ تحقیقات کس زمین پر اور کس آسمان پر ہورہی ہیں۔

معلوم نہیں،ایف آئی اے اور آئی ایس آئی کی فائلوں میں کیا لکھا ہے،لیکن اس مصنف کی چندماہ کی کوششوں کے نتائج یہ ہیں۔

فضائیہ کے تحقیقاتی بورڈ نے شواہد سے ثابت نہ ہونے والے نکات کی نفی کرنے کے عمل process of elimination کے ذریعے قرار دیا کہ حادثے کا کوئی امکان نہیں،اور یقینی طور پر یہ تخریب کاری کا واقعہ ہے۔رپورٹ کے الفاظ یہ ہیں:''ایسے تکنیکی اسباب کی عدم موجودگی سے، جو حادثے کا ذریعہ بنے ہوں، بورڈ کو یقین ہے کہ حادثہ سبوتاژ کی ایک مجرمانہ کارروائی تھی۔''ایک قابل اعتماد ذریعے کے مطابق بورڈ کے ارکان تباہ شدہ جہاز کے ٹکڑوں کو لیبارٹریوں میں ٹیسٹ کرانے کے بعد اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ اس تباہی میں زہریلی گیس استعمال کی گئی،لیکن رپورٹ میں صاف صاف یہ دوٹوک رائے دینے کے بجائے اس طرف اشارہ کرنے پر اکتفا کیا گیا۔اس ذریعے کے مطابق بعض ارکان سے کہا گیا کہ وہ اسے ایک حادثہ ظاہر کرنے کی کوشش کریں،لیکن بورڈ کے ان ارکان نے یہ بات ماننے سے انکار کردیا کہ ان کی رائے میں یہ حددرجہ مضحکہ خیز اور احمقانہ ہوتا، جسے کوئی تسلیم کرنے پر آمادہ نہ ہوتا،لیکن دباو کے نتیجے میں گیس کی تھیوری کا صاف صاف اور برملا اظہار نہ کیا گیا،تاکہ ان خطوط پر تحقیقات تیزی سے آگے نہ بڑھ سکے۔

کراچی میں جمعیت علماے پاکستان کے رہنما ظہورالحسن بھوپالی اور لاہور میں مسلم لیگ کے ممتاز قائد چودھری ظہورالٰہی کو قتل کرنے والی دہشت گرد تنظیم''الذوالفقار'' کے 25 سے زیادہ ارکان 2 اگست کے بعد سے بہاولپور میں مقیم تھے۔ان میں سے کچھ تو پنجاب اسمبلی کے ایک موجودہ ایم پی اے

کے بھائی کے ہاں ٹھیرے ہوئے تھے اور کچھ ہوٹلوں میں۔ ایم پی اے کا یہ بھائی دہشت گردی کے واقعات میں ملوث رہا ہے۔

اس ایم پی اے کا برادر نسبتی جواب ایک اعلیٰ عہدے پر فائز ہے، ایک سرکاری افسر کے گھر میں ٹھیرا ہوا تھا، جو اس کا ہم زلف ہے۔

یہ افسر وہ ہے، جو جہاز گرنے کے بعد نگرانی پر مامور تھا۔ جہاز کا ملبہ اس کے کنٹرول میں تھا۔ اسی کے حکم پر ملبے کے گرد کندھے جوڑ کر گھیرا ڈالا گیا اور اس پر پانی ڈالنے اور تصویر بنانے کی اجازت نہ دی گئی۔ اسی نے بہاولپور کے کمبائنڈ ملٹری اسپتال میں لاشوں کا پوسٹ مارٹم روکنے کا حکم دیا اور پھر ان لاشوں کو لکڑی کے تابوتوں میں ڈال کر کیلیں ٹھونک کر اس ہدایت کے ساتھ روانہ کیا گیا کہ کسی کو ان کو کھولنے کی اجازت نہ دی جائے۔ اس کے بعض رشتہ دار الذوالفقار میں شامل ہیں۔

14 اگست 1988ء کو الذوالفقار کے دو کارندے بہاولپور ڈویژن کی بھارتی سرحد سے پاکستان میں داخل ہوتے ہوئے گرفتار کیے گئے۔ ستلج رینجرز نے ان دونوں کو ایک خفیہ ایجنسی کے حوالے کیا۔ بعد میں کچھ معلوم نہ ہو سکا کہ یہ دونوں کہاں گئے۔ وہ ذرائع سو فی صد قابل اعتماد ہیں، جنہوں نے ان کی گرفتاری اور سپردگی کی اطلاع فراہم کی ہے۔

دو الگ الگ اور معتبر ذرائع کے مطابق الذوالفقار کا سربراہ مرتضیٰ بھٹو 17 اگست کو دہلی کے مشہور اشوکا ہوٹل میں مقیم تھا۔ انہی ذرائع کے مطابق وہ اپریل 1989 میں سندھ کی سرحد سے پاکستان میں داخل ہوا اور بہاولپور پہنچا۔ اس کے پاس ایک بھارتی پاسپورٹ دیکھا گیا۔

اگرچہ بعد ازاں طیارے کو زہریلی گیس سے تباہ کیا گیا، لیکن الذوالفقار کے پاس متبادل منصوبے تھے، جن پر عمل درآمد کی ضرورت محسوس نہ کی گئی۔ ایک منصوبے کے تحت جہاز کو رن وے پر اترتے وقت تباہ کیا جانا تھا اور دوسرے کے تحت جرنیلوں پر مسجد میں ظہر کی نماز پڑھتے وقت حملہ کیا جاتا۔ صدر اور ان کے ساتھیوں نے یہ نماز پہلے سے طے شدہ پروگرام کے تحت مسجد کی بجائے فوجی میس کی گراونڈ میں پڑھی۔

اس وقت جب سی 130 ہوائی اڈے پر کھڑا تھا، اس میں زہریلی گیس کی ایک ڈبیا رکھی گئی۔ اسے کاک پٹ کے ایک پرزے کے سائز کے مطابق بنایا گیا تھا۔ اس پرزے کو نکال کر یہ ڈبیا اس جگہ لگا دی گئی۔ اس کا رنگ اور ساخت مکمل طور پر اس پرزے کے مطابق تھی۔ یہ کام نچلے درجے کے ایک افسر نے ایک اہلکار کی مدد سے کیا۔ خاموشی سے تحقیقات کرنے والے ماہرین کو یقین ہے کہ یہ ڈبیا جسے بعد ازاں ریموٹ کنٹرول سے پھاڑ دیا گیا، کسی طاقتور خفیہ ادارے نے فراہم کی تھی۔ یہ ڈبیا الذوالفقار کے ذریعے بہاولپور پہنچی اور جہاز میں نصب کرنے والوں کے حوالے کر دی گئی۔

منصوبے میں بھارتی خفیہ ایجنسی را کی شرکت سو فیصد یقینی ہے۔ ایک انتہائی قابل اعتماد ذریعے کے مطابق حادثے کے کچھ عرصہ بعد را کے چار ایجنٹوں کو گرفتار کر لیا گیا تھا۔ ان میں سے دو چکلالہ ائربیس سے، جہاں سے جہاز روانہ ہوا اور دو بہاولپور سے پکڑے گئے۔ چکلالہ کے پکڑے جانے والوں نے جہاز اڑنے کے بعد وائرلیس پر بہاولپور میں اپنے دونوں ساتھیوں کو منصوبے پر عمل درآمد کا اشارہ دیا۔ گرفتاری کے بعد ان چاروں نے اعتراف کر لیا۔ انہیں کسی نامعلوم مقام پر رکھا گیا ہے۔ ان کے خلاف کوئی مقدمہ درج کیا گیا ہے، نہ کوئی قانونی کارروائی کی گئی۔ چاروں کا تعلق بھارت کے ایک شہر سے ہے۔ اس کتاب کی تدوین کے دوران یہ اطلاع موصول ہوئی کہ یہ لوگ قتل کر دیے گئے ہیں، لیکن بعد میں معلوم ہوا کہ وہ زندہ ہیں۔

اگرچہ حادثے میں سی آئی اے کے براہ راست ملوث ہونے کا کوئی ٹھوس ثبوت مہیا نہیں کیا جا سکا، لیکن طیارے کی تباہی کے بعد امریکی حکومت پورے عزم کے ساتھ پردہ پوشی پر تل گئی۔ حادثے میں دو امریکی شہری ہلاک ہوئے تھے، لہٰذا امریکی قانون کے تحت خود امریکیوں کو اس کی تحقیقات کرنی چاہیے تھی، مگر ایف بی آئی کی ٹیم کو پاکستان آنے سے روک دیا گیا۔ ائرفورس اور ایف بی آر کے ماہرین کے ایک ایسے وفد کی بجائے جو جرم کے

نشانات سے مجرموں تک پہنچ سکتا، فنی ماہرین کی ایک ٹیم بھیجی گئی، جو صرف حادثے کے اسباب کا سراغ لگا سکتی تھی۔ افغانستان میں سی آئی اے کے ساتھ کام کا تجربہ رکھنے والے ماہرین کا کہنا ہے کہ اگر سی آئی اے چاہتی تو 17 اگست کو رات گئے تک کے ریکارڈ شدہ سگنلز کی مدد سے بہت سے شواہد فراہم کر سکتی تھی۔ بعض امریکی اخبارات اور کانگریس کے دباو پر حادثے کے دس ماہ بعد ایف بی آئی کی ایک ٹیم اسلام آباد پہنچی۔ اس ٹیم کے ارکان حکومت پاکستان کے مہمان تھے۔ وہ صرف ایک بار اسلام آباد سے باہر نکلے، جب وہ سرکاری افسروں کی معیت میں ٹیکسلا کے میوزیم اور کھنڈرات دیکھنے گئے۔ صدر ضیاالحق کے صاحب زادے اعجاز الحق نے جنرل اسلم بیگ کے پائلٹ سمیت کئی گواہوں سے ان کی ملاقات تجویز کی، لیکن وہ ان میں سے اکثر سے نہ ملے۔

نیشنل سیکورٹی کونسل کے ڈپٹی ایڈوائزر مسٹر رابرٹ اوکلے جنہوں نے 17 اگست کو ایف بی آر کی ٹیم کو پاکستان آنے سے روکنے میں اہم کردار ادا کیا تھا، فوراً ہی پاکستان میں سفیر مقرر کر دیے گئے۔ کانگریس کی ''ہاوس جوڈیشل سب کمیٹی آن کرائمز'' کے سامنے شہادت دیتے ہوئے، جب مسٹر اوکلے سے سوال کیا گیا کہ ایف بی آئی کی ٹیم پاکستان کیوں نہ بھیجی گئی تو ان کا جواب تھا کہ اس کا کسی کو خیال ہی نہیں آیا۔'' جس قانون Long Arms Act کے تحت ایف بی آر کی ٹیم کو پاکستان آنا چاہیے تھا، اس کے نفاذ میں مسٹر اوکلے بہت سرگرم رہے تھے۔ ایک دوسرے موقع پر انہوں نے کہا،'' پاکستانی فوج وہ واحد ادارہ تھا، جو حادثے کے بعد ملک سنبھال سکتا تھا، اور ہم اسے عدم استحکام کا شکار نہیں کر سکتے تھے۔''

13 اگست کو بہاولپور میں مقیم ایک امریکی راہبہ (نن) کو پراسرار طور پر قتل کر دیا گیا۔ قاتل کا تعلق الذوالفقار سے تھا، جس کے ارکان اس شہر میں ٹھیرے ہوئے تھے۔ قتل کے اس سنگین واقعہ میں امریکیوں نے کوئی دلچسپی نہ لی اور اسے ڈکیتی کی کوشش قرار دے کر معاملہ دفن کر دیا۔

اس سوال کا کوئی جواب نہیں ملتا کہ را، الذوالفقار اور بہاولپور میں متعین سرکاری افسروں کے درمیان رابطے کے فرائض کس نے انجام دیے۔ یہ ایک طاقت ور خفیہ ایجنسی ہو سکتی ہے۔

ستمبر 1989ء میں جنرل اختر کے صاحبزادے ہارون امریکہ گئے۔ انہوں نے کانگریس کی سب کمیٹی برائے تحقیقات جرائم کے سامنے 5 گھنٹے تک شہادت پیش کی۔ انہوں نے جرم کے بعض واضح نشانات سے ارکان کانگریس کو آگاہ کیا۔ انہوں نے اس معاملے میں بظاہر بڑی دلچسپی ظاہر کی، بعد میں کچھ معلوم نہ ہو سکا کہ امریکیوں نے اس شواہد کی بنیاد پر کیا کارروائی کی۔

بظاہر ایسا نظر آتا ہے اس حادثے سے پیدا ہونے والی صورتحال میں سب سے زیادہ فوائد حاصل کرنے والے امریکی پس پردہ حقائق سے پوری طرح باخبر ہیں۔ جسے نیوز ویک نے ''گہرے تاریک راز'' کا نام دیا ہے۔ لیکن وہ اسے آشکار نہیں کرنا چاہتے، کہ شاید اس کے نتیجے میں انہیں علاقے میں اپنی پسند کی پالیسیاں جاری رکھنے میں مشکلات پیش آ سکتی ہیں۔

اپنے طور پر حادثے کی تحقیقات کرنے والے ایک ماہر کے مطابق امریکیوں کو فوراً ہی اصل حقائق کا علم ہو گیا تھا، اور جب بھی چاہتے زیادہ سے زیادہ ایک ہفتے میں تمام اسرار بے نقاب کر سکتے تھے، لیکن ان کے قومی مفادات کا تقاضا غالباً یہی ہے، وہ اس معاملے پر اسرار کے پردے ڈالے رکھیں، لہٰذا ان کا ہر ادارہ چند قدم کے بعد ٹھٹک کر رک جاتا ہے۔

تمام تر حقائق کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے مصنف کی پختہ رائے یہ ہے کہ اس سازش میں یقینی طور پر بھارتی خفیہ ایجنسی را، دہشت گرد تنظیم الذوالفقار اور چند سرکاری افسر شامل ہیں۔ سانحے کے ذمے دار افراد کو بچانے کی تمام تر ذمے داری امریکہ پر عائد ہوتی ہے، کیونکہ بھارت یا کوئی دوسری طاقت پاکستان میں پردہ پوشی کے لیے فضا ہموار نہیں کر سکتی تھی۔ ایک یا دو سرکاری افسر غالباً نادانستہ طور پر استعمال ہوئے۔

حادثے کے بعد ملتان میں متعین آرٹلری ڈویژن کے کمانڈر میجر جنرل محمود علی درانی کا نام بھی لیا جاتا رہا، جنہوں نے 17 اگست کے مظاہرے کا اہتمام کیا اور صدر سے شریک ہونے پر اصرار کرتے رہے۔ درانی صدر اور جنرل اختر کے قریب رہے تھے۔ ایسی کوئی شہادت نہیں ملتی کہ وہ کبھی ان سے ناخوش ہوئے ہوں۔ انہیں اس سے کوئی فائدہ بھی نہیں پہنچا۔ وہ اب تک اس سانحے پر گہرے ملال کا شکار ہیں۔ اس امکان کو مکمل طور پر مسترد نہیں کیا جا سکتا کہ بعض لوگوں نے انہیں صدر کو بلانے کی تلقین کی ہو اور وہ اس کا مقصد نہ سمجھ نہ پائے ہوں۔ کیا بریگیڈئر امتیاز سانحے کے ذمے دار افراد کی فہرست میں شامل ہیں؟ اس کے باوجود کہ وہ جنرل اختر کو جہاز میں سوار کرنے کے ذمے دار ہیں، یہ لازمی نہیں کہ انہیں سازش کا علم ہو۔ 17 اگست کی رات انہیں جس طرح دھاڑیں مار مار کر روتے دیکھا گیا، اس سے بھی یہ گمان ہوتا ہے کہ وہ معاملے کو سمجھے بغیر استعمال ہوئے۔ تاہم صحیح رخ میں موزوں طریقے سے کی جانے والی ایک تحقیقات ہی سے اس بارے میں حتمی رائے قائم کی جا سکتی ہے۔

سانحے کے بعد یہ تاثر دینے کے لیے بڑی سرگرمی دکھائی گئی کہ اس کے ذمے دار شیعہ ہیں جن کے ایک ممتاز رہنما جولائی 1988ء کے آخر میں شہید کر دیے گئے تھے۔ اس سلسلے میں دو شواہد پیش کیے گئے۔ سب سے پہلے یہ کہا گیا کہ جہاز کے پائلٹ مشہود حسن شیعہ تھے۔ لندن میں الذوالفقار کی طرف سے جاری کیے گئے پریس ریلیز میں مشہود حسن کو اس کریڈٹ دیتے ہوئے ہر سال ان کی برسی منانے کا اعلان کیا گیا۔ لیکن جلد ہی یہ حقیقت سامنے آئی کہ مشہود کی سات پشتوں میں کوئی شیعہ نہیں تھا اور یہ کہ وہ مشہور اخبار نویس الطاف حسن قریشی کے رشتہ دار تھے۔ بعد میں ایک اور کہانی سامنے آئی۔ بعض ذرائع نے دعویٰ کیا کہ ائرفورس کا ایک اور پائلٹ سکواڈرن لیڈر رمیض شیعہ مکتب فکر سے تعلق رکھتا تھا اور چونکہ وہ پاک ون کے کو پائلٹ ساجد کے قریب تھا، لہٰذا اس نے ساجد کی برین واشنگ کی۔ اس کے نتیجے میں پرواز کے دوران ساجد نے جان بوجھ کر کنٹرول سسٹم خراب کر کے جہاز کو تباہ کر ڈالا۔ اس شبہ کی بنیاد پر رمیض کو حادثے کے فوراً بعد گرفتار کر لیا گیا، وہ چھ سات ہفتے زیر تفتیش رہا، اور اطلاعات کے مطابق تفتیش کے دوران اسے اذیت بھی دی گئی۔ آخر کار ائرفورس کے اعلیٰ حکام اس کی مدد کو پہنچے۔ سامنے کی دلیل یہ تھی کہ پائلٹ کے ہوتے ہوئے کو پائلٹ اگر چاہتا بھی تو جہاز نہیں گرا سکتا تھا۔ شیعہ مکتب فکر کو سانحے میں ملوث دکھانے کے لیے کچھ اور کہانیاں بھی گھڑی گئیں اور خفیہ دستاویزات کے نام پر بعض بھدے سے فوٹو سٹیٹ ملک کے سیکڑوں اخبارات اور جرائد کو بھجوائے گئے۔ اس کے پیچھے بھارت سمیت کئی عناصر کا ہاتھ ہو سکتا ہے۔ بھارتی اس سے بڑھ کر کوئی چیز پسند نہ کریں گے کہ پاکستان جو سندھ میں لسانی کشمکش کے المیے سے دوچار ہے، شیعہ سنی فسادات کی زد میں آ جائے۔

قادیانیوں پر الزام لگایا جاتا رہا اور یہ بھی اصل مجرموں سے توجہ ہٹانے کی کوششوں کا حصہ ہی معلوم ہوتا ہے۔

جولائی 1989ء میں پنجاب پولیس نے اپنے طور پر تفتیش کا آغاز کیا اور ایک مرحلے پر ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ وہ مجرموں کو جا لے گی، لیکن پراسرار ہاتھ حرکت میں آ گئے۔ امریکی ایف بی آئی، جرائم کی تحقیقات کرنے والی امریکی کانگریس کی ذیلی کمیٹی اور پاکستانی کی آئی ایس آئی کی طرح اسے کام کرنے سے روک دیا گیا۔ صدیق سالک مرحوم کے صاحب زادے سرمد سالک نے ناقص حفاظتی انتظامات کے ذمے دار اداروں کے خلاف دس کروڑ ہرجانے کی رٹ دائر کر رکھی ہے۔ 1989ء کے آخر میں عدالت نے سرمد سالک کے حق میں یکطرفہ طور پر فیصلہ دے دیا، کیونکہ حکومت نے اپنا موقف پیش کرنے سے گریز کیا تھا۔ بعد ازاں حکومت نے اس فیصلے کے خلاف ہائی کورٹ ہی میں اپیل دائر کی، جو ابھی زیر سماعت ہے۔ اب یہ ایک دوسرے جج کے پاس ہے، جبکہ فیصلہ سنانے والے جج تبدیل ہو کر لاہور آ گئے ہیں۔ سرمد سالک کی طرف سے دائر کی گئی ایک دوسری رٹ میں عدالت کے فیصلے کے بعد، جس میں پنجاب پولیس اور ایف آئی اے کو سرگرمی سے تحقیقات نہ کرنے کا ذمے دار قرار دیا گیا تھا، بعض متاثرہ خاندانوں نے وزیر اعلیٰ پنجاب سے رابطہ قائم کیا اور انہیں یاد دلایا کہ عدالتی حکم کے بعد نتیجہ خیز تحقیقات پنجاب پولیس کی ذمے داری ہے، جس کی حدود میں یہ واقعہ پیش آیا۔

جولائی 1989ء میں وزیراعلیٰ پنجاب نے ملتان کے ایس ایس پی احمد نواز خان نیازی کو طلب کیا اور کہا کہ وہ پوری آزادی اور ذمے داری کے ساتھ مجرموں کا سراغ لگانے کی کوشش کرے۔ احمد خان نیازی چند ہی ہفتوں کے اندر یہ معلوم کرنے میں کامیاب ہو گیا کہ 17 اگست 1988ء کو بہاولپور میں الذوالفقار کے سات ایجنٹ موجود تھے۔ اس نے بعض گواہیاں ریکارڈ کیں اور یہ پتا چلا لیا کہ اس میں را کا ہاتھ ہو سکتا ہے۔ اسے اپنی تفتیش کو آگے بڑھانے کے لیے ایف آئی اے کے تعاون کی ضرورت تھی۔ اس کی تجویز پر پنجاب پولیس نے سرکاری طور پر ایف آئی اے کو لکھا کہ وہ سانحہ بہاولپور کے سلسلے میں 1988ء میں شروع کی جانے والی اپنی تفتیش کے نتائج سے پنجاب پولیس کو آگاہ کرے، اور متعلقہ دستاویزات اس کے حوالے کی جائیں۔ ایف آئی اے کے مرکزی دفتر نے اس درخواست کا کوئی جواب نہ دیا۔ چنانچہ یاددہانی کے کئی خط لکھے گئے اور جب انہوں نے جواب لکھا تو اس میں کہا گیا کہ پنجاب پولیس کو سانحہ کے ایک سال بعد تحقیقات کا خیال کیوں آیا۔ خط میں کہا گیا کہ پنجاب پولیس اسلامی جمہوری اتحاد کے کہنے پر سیاسی مقاصد کے لیے تحقیقات کرنا چاہتی ہے۔ پولیس کا جوابی استدلال یہ تھا کہ ملک کے صدر اور 28 اعلیٰ فوجی افسروں کے قتل کی تحقیقات محض اس لیے ختم نہیں کی جا سکتی کہ اس کے نتائج سیاسی ہو سکتے ہیں۔ نیازی نے گواہوں اور شواہد کی بنیاد پر یہ رائے قائم کی کہ 17 اگست کے سانحہ کی منصوبہ بندی رانے کی تھی، جس کی مدد سے الذوالفقار کے ایجنٹ بھارت سے بہاولپور 14 کلومیٹر دور بھارتی سرحد سے پاکستان میں داخل ہوئے۔

حتمی نتائج اخذ کرنے کے لیے وہ 17 اگست کو بہاولپور کے ہوائی اڈے پر حفاظتی انتظامات کے ذمہ دار بعض فوجی افسروں سے پوچھ گچھ کرنا چاہتا تھا۔ اس نے اپنے بعض اہل کار فوجی رجمنٹوں میں بھیجے، لیکن کسی نے انہیں گھاس نہ ڈالی نیازی جلد ہی شکایت کرنے لگا کہ نہ صرف تحقیقات سے اچانک الگ ہو جانے والی آئی ایس آئی، بلکہ خود اس کا اپنا محکمہ بھی اس کی نگرانی کرتا ہے۔ وہ گھبرایا ہوا تھا اور سہارے کا طالب تھا، لیکن کسی نے اس کی مدد نہ کی۔ اگلے روز وہ بھاگم بھاگ ہوائی اڈے پر پہنچا، جہاں وزیراعلیٰ کسی تقریب کے سلسلے میں موجود تھے۔ صرف ایک چیز اس کی نوکری کی ضمانت دے سکتی تھی کہ وزیراعلیٰ تفتیش کی تصدیق کر دیں۔ دوسری صورت میں اسے ہوائی اڈے سے دفتر کی بجائے سیدھے اپنے گھر چلے جانا چاہیے تھا۔ اس وقت رپورٹ کی جان میں جان آئی، جب وزیراعلیٰ نے کہا، ''17 اگست 1988 کے سانحہ بہاولپور کے سلسلے میں پنجاب پولیس کی تفتیش جاری ہے اور اس سلسلے میں کچھ پیش رفت بھی ہوئی ہے۔ اس سانحہ کے بارے میں ہائی کورٹ نے بھی حکومت پنجاب سے رپورٹ مانگی ہے، جو ہم عدالت میں پیش کریں گے، جس سے تمام صورت حال منظر عام پر آ جائے گی۔'' جب ان سے سوال کیا گیا کہ آئی جی نے تو تفتیش سے لاعلمی کا اظہار کیا ہے تو انہوں نے کہا، '' پنجاب پولیس ایسے واقعات کی تفتیش سے غافل نہیں رہ سکتی اور یہ پولیس کا فرض ہے کہ جہاں بھی اس نوعیت کا کوئی واقعہ رونما ہو، چاہے کوئی دوسری ایجنسی اس کی تفتیش کرے یا نہ کرے، پنجاب پولیس اس کی تفتیش ضرور کرے گی۔'' رپورٹر کے چہرے پر رونق آ گئی، اس کی نوکری محفوظ تھی، لیکن سوال یہ تھا کہ آئی جی سلمان قریشی تردید کیوں کر رہے ہیں؟ اخبارات نے یہ جاننے کی کوشش نہیں کی، البتہ اسی روز آئی جی کا ایک بیان اخبار میں شائع ہوا کہ پنجاب میں سندھ ایسی صورت حال پیدا کی جا رہی ہے۔

یکم دسمبر 1989 کو ٹوبہ ٹیک سنگھ میں ایک جلسہ عام سے خطاب کرتے ہوئے وزیراعلیٰ نے اپنے اعلان کو دہرایا کہ پنجاب حکومت حادثہ بہاولپور کی تحقیقات کرے گی اور رپورٹ عوام کے سامنے پیش کی جائے گی۔ وزیراعلیٰ کے الفاظ یہ تھے: ''شہید جنرل محمد ضیاالحق کے طیارے کا حادثہ ایک بہت بڑی تخریب کاری تھی، جس سے ملک کا صدر اور کئی ایک فوجی جرنیل شہید ہو گئے۔ موجودہ وفاقی حکومت نے اس سلسلے میں کوئی تفتیش نہیں کی اور ایف آئی اے کو آرام سے بٹھا دیا کہ تفتیش کرنے کی ضرورت نہیں۔ حکومت پنجاب نے ایف آئی اے سے رابطہ کیا اور اس نے اس المناک حادثہ کے بارے میں جو شواہد جمع کیے ہیں، وہ حکومت پنجاب کے حوالے کر دیے جائیں، لیکن انہوں نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا۔ اس انکار سے بڑا جرم کیا ہو سکتا ہے؟

وزیراعلیٰ کے خطاب کے ٹھیک تین دن بعد آئی جی سلمان قریشی نے ڈی آئی جی ملتان کو حکم دیا کہ ایف آئی آر نمبر 252 سانحہ بہاولپور کی تفتیش اس وقت تک روک دی جائے، جب تک ہم وزارت قانون کی قانونی رائے نہیں جان لیتے۔'' آئی جی نے یہ حکم اس وقت جاری کیا، جب وزیراعلیٰ کو عمرہ کے لیے حجاز روانہ ہوئے چند گھنٹے گزرے تھے۔ٹیلکس کے ذریعے بھیجے جانے والے اس پیغام کی نقل اخبارنویسوں کے ہاتھ لگ گئی، اور 6 دسمبر کو کراچی اور اسلام آباد کے دو اخبارات نے یہ خبر شائع کر دی۔ اس خبر میں بتایا گیا تھا کہ سلمان قریشی یہ سب کچھ وفاقی حکومت کے ایما پر کر رہے ہیں، جن سے بعض مرکزی وزرا نے امریکہ میں مقیم ان کے بھائی کے توسط سے رابطہ قائم کیا ہے اور یہ کہ اگر انہیں آئی جی کے منصب سے ہٹایا گیا تو انہیں ایف آئی اے کی سربراہی سونپ دی جائے گی۔ 24 گھنٹے کی خاموشی کے بعد آئی جی نے ایک مختصر سا بیان جاری کیا، جو 8 دسمبر کے اخبارات میں اس طرح چھپا: ''انسپکٹر جنرل پولیس پنجاب سلمان قریشی نے وضاحت کی ہے کہ پنجاب پولیس نے سانحہ بہاولپور کی تحقیقات ختم نہیں کی ہے۔ انہوں نے کہا، اعلیٰ سطحی ٹیم اس ہوائی حادثہ کی تحقیقات کر رہی ہے اور ایف آئی اے کو متعلقہ فائل واپس کرنے کا کہا گیا ہے۔

آئی جی نے خبر کی تردید کر دی، مگر انہوں نے یہ وضاحت نہیں کی کہ کیا انہوں نے تفتیش روکنے کا حکم دیا تھا یا نہیں۔ وہ اس پوزیشن میں نہیں تھے کہ اس بارے میں صاف صاف بیان جاری کر سکتے،، کیونکہ اخبارنویسوں کے پاس ان کے ٹیلیکس سے بھیجے گئے پیغام کی فوٹو کاپی موجود تھی۔ آئی جی نے اس بارے میں بھی یکسر خاموشی اختیار کر لی کہ ٹھیک نو دن پہلے انہوں نے یہ دعویٰ کس طرح کیا تھا کہ تحقیقات کا آغاز تک نہیں ہوا اور اب وہ کس بنا پر کہہ رہے ہیں کہ تفتیش ترک نہیں کی گئی۔ آئی جی کے بیان میں کلیدی جملہ وہ تھا، جس پر کسی نے غور تک نہیں کیا اور جس کی حقیقت اگلے ہفتوں اور مہینوں میں کھلی۔ ''ایف آئی اے کو متعلقہ فائل واپس کرنے کو کہا گیا ہے۔'' ایف آئی اے تو دسمبر 1988ء ہی سے تفتیش ترک کر چکی تھی اور اس نے جولائی ہی میں پنجاب پولیس کو فائل دینے سے انکار کر دیا تھا۔ پنجاب پولیس کا سربراہ اب دسمبر میں اس فائل کا حوالہ کیوں دے رہا تھا، کیا اس کا مطلب اگلے دنوں میں کیس کو آگے بڑھانے سے روکنے کے لیے ایک بہانہ تلاش کرنا تھا؟

بدترین اندیشے درست ثابت ہوئے اور 8 دسمبر کو جاری کردہ تردید کے بجائے آئی جی کے 4 دسمبر کے پیغام پر عمل درآمد ہوا۔ کچھ عرصہ بعد احمد نواز نیازی کا تبادلہ ملتان سے لاہور کر دیا گیا۔ آئی ایس آئی کے سربراہ جنرل حمید گل نے جو سرکاری ملازمت میں رہتے ہوئے سچ بولنے پر مصر تھے، اور غیر ملکی سازشوں کی مزاحمت کر رہے تھے، فروری 1990ء میں سانحہ بہاولپور کی تحقیقات کرنے والے ڈیسنٹی فیئر کو بتایا تھا کہ ان کے ادارے کو تفتیش سے الگ کیا جا چکا ہے، ایف آئی اے سے کسی توقع کا سوال ہی نہیں تھا۔ اور اب پنجاب پولیس کے محاذ پر بھی سازشی جیت گئے ہیں، جن کے ہاتھ بہت، بہت لمبے ہیں۔'' احمد نواز نیازی بعد میں لاہور چلا گیا اور اس کے بارے میں سلمان قریشی کی طرح کئی کہانیاں سننے میں آتی رہیں۔ تفتیش اب ایک اور افسر کے سپرد کر دی گئی، جسے ابتدا سے کام کا آغاز کرنا تھا۔

کیا صدر ضیاالحق اور جنرل اختر کے قاتلوں کا سراغ لگا لیا جائے گا، یا وزیراعظم لیاقت علی خان کی شہادت کے سانحہ کی طرح اسرار کا پردہ گہرا ہوتا جائے گا۔ 1951 کے برعکس 1988ء کا سانحہ اپنے پیچھے بہت سے نشانات چھوڑ گیا ہے۔ قاتل زندہ ہیں اور ان کے خلاف زندہ اور جیتے جاگتے ثبوت بھی موجود ہیں، جواب ضائع نہیں کیے جا سکتے ہیں۔ ایک ممتاز شخصیت کا خیال ہے کہ اگر دو خرانٹ تھانیداروں کو آزادی، اختیارات، اور وسائل کے ساتھ یہ ذمے داری سونپ دی جائے تو مجرموں کو ایک ہفتے کے اندر کٹہرے میں کھڑا کیا جا سکتا ہے، اس مصنف کی رائے بھی یہی ہے۔ امریکہ پردہ پوشی پر تلا ہوا ہے۔ یہ خود امریکی اخبارات کی رائے ہے۔ بےنظیر بھٹو کے نزدیک جن کے والد کو صدر ضیاالحق کے دور اقتدار میں پھانسی دی گئی، یہ ''خدائی انصاف'' تھا۔ الذوالفقار کے سربراہ مرتضیٰ بھٹو شام میں پناہ گزیں ہیں، جہاں 1981ء میں اغوا کیا جانے والا پی آئی اے کا طیارہ لے جایا گیا تھا۔

اگر ملک کی ایک بھی طاقت ور سیاسی جماعت یا طاقت ور پریشر گروپ پوری طاقت سے یہ سوال اٹھا سکتا تو حکومت کے لیے مشکلات پیدا ہو جاتیں، لیکن سیاسی جماعتیں یہ سوال کیوں اٹھائیں، انہیں اس سے کیا حاصل ہوگا، صوبائی اسمبلیوں، قومی اسمبلی اور سینیٹ میں جہاں کسی رکن سے کسی سرکاری افسر کے الجھ پڑے پر بھی استحقاق کی تحریک پیش کی جاسکتی ہے، اس سوال کو باضابطہ طور پر زیر بحث لانے کی ایک بھی معقول کوشش نہیں کی گئی۔ اخبار نویس، دانشور اور سیاسی کارکن سانحہ 17 اگست کو بھول جانا چاہتے ہیں۔ طاقت ور ادارے، حکمران اور پردے کے پیچھے حرکت کرنے والے پراسرار ہاتھ سرگرم عمل ہیں، لیکن ان کی کامیابی ادھوری ہے۔ ضیاالحق اپنے پیچھے کوئی جماعت چھوڑ کر نہیں گئے، مگر بے شمار دلوں میں وہ اب بھی زندہ ہیں، 17 اگست 1989، 1990، 1991ء میں اتنے لوگ اسلام آباد میں جمع ہوئے کہ اس شہر نے اپنی تاریخ میں ایسے اجتماعات اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھے تھے۔

وہ ایک عجیب جنگ تھی، جو افغانستان میں لڑی گئی۔ تاریخ انسانی کی سب سے بڑی چھاپہ کار جنگ، تاریخ کی سب سے زیادہ خفیہ جنگ، دو جرنیلوں نے یہ جنگ اپنی قوم کے بغیر لڑی اور اپنی فوج کے بغیر بھی، ایک خفیہ ادارے کے بل پر جنگوں کی تاریخ میں پہلے کبھی ایسا نہیں ہوا تھا، اور شاید آیندہ بھی کبھی ایسا نہ ہوسکے گا۔ جب وہ لمحہ آیا، جس سے آگے تاریخ کی جاودانی تھی، تو وہ قتل کر دیے گئے۔ تکمیل پاتے ایک خواب کے ساتھ وہ بہت سے دوسرے خواب دیکھ رہے تھے۔ افغانستان کے بعد کشمیر کی آزادی کا خواب، اور افغانستان میں خائب اور خاسر ہو کر لوٹ جانے والے سوویت یونین کی زنجیر میں جکڑے مسلمانوں کی آزادی کا خواب، پاکستان، ایران، ترکی، اور آزاد افغانستان پر مشتمل ایک اتحاد کا خواب، جو مسلمانوں کو مکمل آزاد کر دے اور صدیوں کے ادبار سے انہیں نجات دلا دے۔ ان کی اپنی قوم تو اس خواب کی رفعت سے آشنا نہ ہوسکی، لیکن دشمن انہیں پہچان گئے۔ بھارتیوں نے اسے سمجھ لیا، جن کے ہاتھوں سے پنجاب اور کشمیر نکل جانا تھا۔ روسیوں نے اسے جان لیا جنہیں اپنی تاریخ کی سب سے زیادہ المناک شکست کا سامنا کرنا پڑا اور امریکی تو ان جرنیلوں کو خوب جانتے تھے، جن کی بھرپور کوششوں کے باوجود انہوں نے ایٹمی پروگرام اور ایران پالیسی پر سمجھوتہ کرنے سے انکار کر دیا تھا۔

کیا اب یہ خواب کبھی پورا نہیں ہوسکے گا، اور ہماری آزادی ادھوری رہے گی۔ 1989ء کے وسط میں ایک پاکستانی نوجوان امریکہ گیا۔ اس نے دنیا میں سب سے زیادہ پڑھے جانے والے جریدے سے متعلق ایک اخبار نویس سے ملاقات کی۔ اس کے کمرے میں زخمی افغان بچوں کی تصاویر آویزاں تھیں اور ایک پاکستانی جرنیل۔۔۔ جنرل اختر عبدالرحمٰن کی تصویر۔ اس نے کہا، جب وہ مایوس اور آزردہ ہو جاتا ہے تو وہ ان تصویروں کو دیکھتا اور ان سے اکتساب نور کرتا ہے۔ نومبر 1989ء میں بائیں بازو سے تعلق رکھنے والے ایک پاکستانی اخبار نویس کو مقبوضہ کشمیر جانے کا موقع ملا۔ واپسی پر اس نے لکھا کہ ''کشمیر کے ہر گھر میں آمر (جنرل ضیاالحق) کی تصویر مسکراتی ہے۔'' افغانستان سے آنے والے خبر دیتے ہیں کہ ایک ہزار سے زیادہ جنگی مورچوں میں ہر کہیں ان کی تصاویر دیکھی جاسکتی ہیں، جنہیں ان کی قوم فراموش کرنے کی کوشش کر رہی ہے۔

وقت اب بھی حرکت میں ہے۔ زمین اور آسمان پر اب بھی اسی کی بادشاہت ہے، جس نے انسان کو ارادہ و عمل کا اختیار بخشا اور خواب دیکھنا سکھائے۔ جو شہید ہوئے، وہ شہید ہوئے، اب یہ ان پر ہے، جو زندہ ہیں اور آرزو کر سکتے ہیں۔ کیا وہ آرزو کریں گے یا تاریخ کے چوراہے پر لمبی تان کر سو جائیں گے؟